ڈاکٹر محمد خاور نوازش
استاد، شعبہ اُردو ،بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان

سرسید اور اقبال کا تصورِ تہذیب اور عصری صورتحال

Dr. Muhammad Khawar Nawazish
Assistant Professor, Department of Urdu, B.Z.U, Multan

Sir Syed and Iqbal's Concept of Civilization and Current Situation

Sir Syed Ahmad Khan is the very first thinker in British India who coined the concept of civilization in Urdu. Although he was inspired by H.T. Buckle and took basic theme of civilization from his renowned work "History of Civilization in England" but he also disagreed to Buckle. According to Sir Syed, it is wrong to think that State and Religion have the full authority to set the outlines of individual life. He knew that such thoughts would have streamlined the goals of colonialism. Undoubtedly, Sir Syed was a great advocate of British Government but he always kept in mind the interests of his nation. His concept of civilization is simply drawing a line between savagery and humanity. According to Sir Syed, civilization starts with realizing that other human beings also have emotions and sentiments. It is true that Sir Syed and Iqbal's emphasis on different political, religious and social aspects changed naturally with time but they shared the ideological commonality regarding civilization. In 'Javed Nama', Iqbal has clearly defined the veracity of civilization as respect towards human being (Ehtram e Adam). In this paper Sir Syed and Iqbal's thoughts regarding civilization are discussed from the perspective of contemporary situation of Pakistan.

Key Words: *Sir Syed. Iqbal. Civilization. Culture. Buckle. Humanity. Savagery. Javed Nama. Colonialism. Social Perspective.*

بڑی قومیں اپنے پرانوں کی عظمت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ نئے ہیروز کی تلاش پر بھی یقین رکھتی ہیں۔ جب کسی ریاست میں پیدا ہونے والے نئے بڑے لوگوں کی بڑائی کو مذہب، عقیدے، مسلک، سیاسی وابستگی، معاشی حالت، عمر، رنگ اور نسل کی بنیاد پر تسلیم کرنے میں تامل برتا جائے تو وہاں اُسی عہد میں پیدا ہونے والے نئے چھوٹے لوگوں کی چھوٹائی کو شہرت پانے کا موقع مل جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے کی اکثریت کے ذہن پر ایسے سوالات کا غلبہ ہوتا ہے کہ پاکستانی نژاد

ڈاکٹر ارجمند ہاشمی (ستارۂ امتیاز) نے امریکی ریاست ٹیکساس کے ایک ٹاؤن پیرس اور محمد صادق نے برطانیہ کے سب سے بڑے شہر لندن کا مئیر بننے کے بعد عیسائی مذہبی روایات کے تحت جب چرچ میں حلف اٹھایا تو آیا وہ مسلمان رہے یا نہیں یا اُس حلف کی نوعیت کیا ہو گی! یا پھر ہم ابھی اِسی فکر میں مبتلا ہوتے ہیں کہ میڈیکل سائنس میں پاکستان کا نام روشن کرنے والے ڈاکٹر نوید سید کا تعلق سنی مسلک سے ہے یا شیعہ مسلک سے! یا ہم یہ سوچ رہے ہوتے ہیں کہ جس ڈاکٹر عمر سیف (تمغۂ امتیاز) کو ایم آئی ٹی ریویو نے کمپیوٹر کی فیلڈ میں دنیا کے پینتیس بڑے سائنس دانوں میں شمار کیا اور گذشتہ دو سال سے چند جید ادارے انھیں پانچ سو با اثر ترین مسلمانوں کی فہرست میں بھی شامل کر رہے ہیں وہ تو مسلم لیگ نواز کی حکومتِ پنجاب سے بطور مشیر وابستہ رہے ہیں! اِسی طرح ایک خاص طبقہ بوجوہ اس بات پر بھی مشوش نظر آتا ہے کہ آیا پہلی پاکستانی خلاباز خاتون نمیرا اسلیم (تمغۂ امتیاز)، آسکر جیتنے والی شرمین عبید چنائے (تمغۂ امتیاز) اور امن کا نوبل انعام جیتنے والی ملالہ یوسف زئی ہماری ہیروز کہلوانے کی اہل بھی ہیں یا نہیں۔ ہمارے معاشرے میں مذہب، مسلک، سیاست، نسل اور جنس وغیرہ ایسے عوامل ہیرو کے معیار کے تقرر میں حائل ہوتے رہتے ہیں اور اسی دوران اچانک سے [قصور سے تعلق رکھنے والی] زینب کا سفاک قاتل ہماری روح پرور مذہبی محفلوں کے سٹیج سے برآمد ہوتا ہے اور پوری دنیا کے میڈیا چینلوں پر اس کی سفاکانہ حرکت پر خصوصی نشریات چلنے لگتی ہیں۔ اس نشریات کے دوران ملکی و غیر ملکی تجارتی کمپنیوں کے کروڑوں کے اشتہارات چلتے ہیں۔ انسانیت کو شرما دینے والے اور ہماری تہذیب کی عظمت کی طرف جوتا اچھالنے والے ایسے واقعات میڈیا منڈی میں ایک کموڈٹی کی طرح بکتے ہیں۔ تہذیبی زوال آمادگی کا نوحہ چند دن پڑھا جاتا ہے اور پھر وہی معمولاتِ زندگی۔ پوری مہذب دنیا جب ایسے کی مذمت کر کے ہمارا منھ چڑاتی ہے تو ہم پاکستانی تہذیب کی عظمت بیان کرتے ہوئے انھیں بتاتے ہیں کہ ہم مہر گڑھ، ٹیکسلا، ہڑپہ اور موہن جو داڑو کی صدیوں پرانی اُن تہذیبوں کا تسلسل ہیں جن کے دریافت شدہ آثار میں ایک گھر کا دروازہ دوسرے گھر کے دروازے سے ایک فٹ بھی آگے تجاوز نہیں کرتا تاہم یہ الگ بات ہے کہ ہماری ریاست میں دہشت گردوں کے بعد سب سے زیادہ آپریشنز ناجائز تجاوزات کے خلاف ہوتے ہیں۔ عصری صورتحال ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ ہم جس عظیم تہذیب کے وارث تھے اُس کے تسلسل میں غلطی کہاں ہوئی اور کیا وہ غلطی مسلسل دہرائی تو نہیں جا رہی۔ تہذیب کے روایتی تصور کی رُو سے یہ مجموعی انسانی کاوشوں اور طرزِ حیات کا نام ہے لیکن عصرِ حاضر میں اس کی باگ ڈور کارپوریٹ کلچر کے جنم داتاؤں کے ہاتھ میں چلی گئی ہے۔ تہذیب اور انسان [گویا انسانیت] جو لازم و ملزوم سمجھے جاتے ہیں کارپوریٹ کلچر میں انھیں ایک دوسرے سے کاٹنے میں سب سے زیادہ توانائی صرف ہو رہی ہے۔ اس کلچر کی ماہیت پر غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ غلط ہو یا صحیح، انسانیت پر مبنی ہو یا حیوانیت پر، خیر کے لیے ہو یا شر کے لیے اصل، حقیقی، قیمتی غرض یہ کہ ہر طرح سے قابلِ قدر وہی ہے جو منڈی میں بکتا ہے اور جس کی قیمت زیادہ ملتی ہے۔ انسانیت نام کے کسی جذبے یا خیال کی کارپوریٹ کلچر میں کوئی جگہ نہیں جبکہ تہذیب کی ماہیت پر غور کریں تو اس کا آغاز حیوانیت کے انسانیت پر خاتمے سے ہوتا ہے۔ عصرِ حاضر میں تہذیب کا متذکرہ تصور روایتی سمجھا جاتا ہے لیکن صدیوں کے ارتقا کی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ دنیا کے ہر خطے کی تہذیب کی اصل یہ روایتی تصور ہی ہے۔

برصغیر میں تہذیب کے اس روایتی تصور پر سرسید احمد خان (۱۸۱۷ء۔۱۸۹۸ء) اور علامہ اقبال (۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء) کے افکار و نظریات کو آج بھی سب سے زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے۔ سرسید احمد خان کا تصورِ تہذیب دراصل اُن کے ہم عصر برطانوی مورخ ہنری تھامس بکل [Henry Thomas Buckle] (۱۸۲۲ء۔ ۱۹۶۲ء) کی کتاب ہسٹری آف سویلائزیشن اِن انگلینڈ[History of Civilization in England]سے ماخوذ سمجھا جاتا ہے لیکن یہ بھی دلچسپ حقیقت ہے کہ سرسید نے بکل کے اُن نکات سے اختلاف کیا جو سامراجی مفادات کا تحفظ کرتے ہوں۔ بکل نے تہذیبِ عالم کی کئی جلدوں میں مفصل تاریخ لکھنے کا منصوبہ بنایا تھا لیکن اپنی وفات تک صرف دو جلدیں ہی مکمل کر سکا۔ [۱]

سبطِ حسن کا خیال ہے:

> ”بکل نے انسانی تہذیب کی تاریخ سائنسی معلومات کی روشنی میں لکھنے کی کوشش کی تھی اور استقرائی اصولوں کی بنیاد پر انسانی تاریخ کے کچھ ”قوانین“ بھی وضع کیے مثلاً موسم کا قانون۔ اور یہ ثابت کیا تھا کہ انسانی تہذیب پر طبعی ماحول اور موسم کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ بکل کے ”نظریات“ گو تاریخی حقائق کے سرتاسر خلاف تھے (وادیٔ سندھ، وادیٔ نیل اور وادیٔ دجلہ و فرات کی قدیم تہذیبوں کا طبعی ماحول یورپ سے مختلف تھا پھر بھی ان تہذیبوں کی عظمت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا) اس کے باوجود اہلِ فرنگ نے بکل کے خیالات کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا تھا کیونکہ اس نے سفید فام قوموں کے غلبے اور ایشیائی قوموں کی غلامی کو قانون قدرت کی شکل دی تھی اور اس طرح برطانیہ کے سامراجی مفادات کے لیے ایک نظریاتی جواز پیش کیا تھا۔“[۲]

برصغیر سے تعلق رکھنے والے جن سرسید مخالفین نے انھیں سامراج کا دوست ہونے کا طعنہ دیتے ہوئے اعتراضات اٹھائے ہیں اُن کا بھی بنیادی استدلال یہی ہے کہ سرسید کی فکر مغربی سامراج کے مفادات کو نظریاتی جواز مہیا کرتی ہے۔ حالانکہ وہ اس خطے کی تاریخ میں پہلا بڑا آدمی ہے جس نے سامراج کے نہیں بلکہ اپنے ہم وطنوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے سسٹم سے بغاوت کی بجائے سسٹم کے اندر رہ کر کام کرنے کی دانش مندانہ راہ اُس وقت اختیار کی جب ہندوستانی اور بالخصوص مسلمان ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی ملامت سے چھپ رہے تھے اور سرکارِ انگلشیہ کی نظر میں باغی تھے۔ سرسید اُس تصورِ تہذیب سے متاثر ضرور ہوئے جو بکل نے پیش کیا لیکن اُس سے کھلا اختلاف بھی کیا۔ سرسید کا مضمون بعنوان ’تہذیب اور اُس کی تاریخ اور افعالِ انسانی کے باقاعدہ ہونے کا ثبوت‘ اُن کے تصورِ تہذیب کو سمجھنے کے لیے بنیادی اور اہم ترین ہے۔[۳] سرسید نے اُس مضمون میں نہ صرف تہذیب کی تعریف پیش کی ہے بلکہ اس کے عناصر اور عوامل کا بہت جامع انداز میں جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ تہذیب کوئی جامد چیز نہیں بلکہ نیچر کے قاعدوں کے قریب تر رہتے ہوئے حرکت کے قوانین کو اختیار کرنے کا نام ہے۔ اچھے اور برے میں موجود فرق کا فطری احساس اور برے کو اچھا بنانے کی کوشش تہذیب کا آغاز تھا۔ اُس مضمون سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

”ایک گروہ انسانوں کا کسی جگہ اکٹھا ہو کر بستا ہے تو اکثر اُن کی ضرورتیں اور اُن کی حاجتیں، اُن کی غذائیں اور اُن کی پوشاکیں، اُن کی معلومات اور اُن کے خیالات، اُن کی مسرت کی باتیں اور اُن کی نفرت کی چیزیں سب یکساں ہوتی ہیں اور اسی لیے برائی اور اچھائی کے خیالات بھی سب میں یکساں پیدا ہوتے ہیں اور برائی کو اچھائی میں تبدیل کرنے کی خواہش سب میں ایک سی ہوتی ہے اور یہی مجموعی خواہشِ تبادلہ یا مجموعی خواہش سے وہ تبادلہ اُس قوم یا گروہ کی سولزیشن ہے۔“(۴)

اس اقتباس میں سرسید نے تہذیب کے عناصرِ ترکیبی بھی گنوا دیے ہیں۔ ضرورتیں اور حاجتیں یقیناً طبعی حالات اور آلات و اوزار سے جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ غذاؤں اور پوشاکوں کا تعلق بھی انھی سے ہوتا ہے۔ اسی طرح سے معلومات، خیالات، مسرت اور نفرت کی باتیں نظامِ فکر و احساس اور سماجی اقدار سے جڑی ہوئی چیزیں ہیں۔ ان سب میں ہی آب و ہوا، رہن سہن کے انداز، رسوم و رواج، طرزِ عمل، ذریعۂ معاش، ارد گرد کو دیکھنے، سمجھنے اور اس کے متعلق سوچنے اور بولنے کا انداز، خیالات و اعتقادات، کل افعالِ ارادی، معاشرتی روابط، اظہارِ فن کے طریقے غرض یہ کہ مجموعی طرزِ زندگی شامل ہے اور سرسید کے خیال میں یہ مجموعی طرزِ حیات عام طور پر کسی ایک جغرافیے میں آباد انسانوں میں یکساں ہوتا ہے۔ اگر کہیں یہ یکساں نہ ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ انسانوں کا گروہ تبدیل ہو گیا ہے یا کسی گروہ کا جغرافیہ تبدیل ہو گیا ہے۔ تہذیبی تبدیلی کی اساس صرف اسی بات پر ہی ہے۔ ایسی تہذیبی تبدیلی کے باوجود اچھے اور برے کے درمیان تمیز کا فطری احساس انسانوں میں یکساں رہتا ہے۔ بقولِ سرسید تکلیف سے بچنے اور آسائش حاصل کرنے کا سب کو یکساں خیال ہے۔ (۵) اسی مضمون میں آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

”جس طرح ہم تہذیب کا قدرتی لگاؤ تمام انسانوں میں پاتے ہیں اسی طرح اس کا تعلق عقلی اور مادی سب چیزوں میں دیکھتے ہیں۔ جس چیز میں کہ ترقی یعنی برائی سے اچھائی کی طرف رجوع یا ادنیٰ درجے سے اعلیٰ درجے کی طرف تحریک ہو سکتی ہے، اسی سے تہذیب بھی متعلق ہے۔ پس سولزیشن یا تہذیب کیا ہے؟ انسان کے افعالِ ارادی اور جذباتِ نفسانی کو اعتدال پر رکھنا، وقت کو عزیز سمجھنا، واقعات کے اسباب کو ڈھونڈنا اور ان کو ایک سلسلے میں لانا۔ اخلاق اور معاملات اور معاشرت اور طریقِ تمدن اور علوم و فنون کو بقدرِ امکان قدرتی خوبی اور فطری عمدگی پر پہنچانا اور ان سب کو خوش اسلوبی سے برتنا اور اُس کا نتیجہ کیا ہے، روحانی خوشی اور جسمانی خوبی اور اصلی تمکین اور حقیقی وقار اور خود اپنی عزت کی عزت اور درحقیقت یہی پچھلی ایک بات ہے جس سے وحشیانہ پن اور انسانیت، تمیز ہوتی ہے۔“(۶)

گویا جب کوئی گروہ اپنے اخلاق، معاملات، معاشرت، رہن سہن اور علوم و فنون کو فطری عمدگی کی امکانی حدوں تک پہنچاتا ہے اور خوش اسلوبی سے برتتا ہے تو نتیجے میں روحانی خوشی اور معاشرے میں عزت اور وقار نصیب ہوتا ہے۔ اسی کا

نام ترقی اور ترقی کی سعی ہے اور یہی وحشیانہ پن کا خاتمہ اور انسانیت کی نوید ہوگی۔ لیکن مندرجہ بالا اقتباس میں انسان کے ارادی افعال اور جذبات کا اعتدال میں رکھنے کی جو بات کی گئی ہے اُس کے لیے ظاہر ہے کچھ ایسے اُصول اور قاعدے ضروری ہوں گے جن پر زندگی عمل پیرا ہو۔ ہنری بکل نے زندگی کرنے کے اُصول اور قاعدوں کی تفویض کاری سلطنت اور مذہب کو سونپی ہے یعنی سلطنت رعایا کو یہ سکھائے کہ اُن کو کیا کرنا چاہیے اور مذہب یہ بتائے کہ کس بات پر یقین رکھنا چاہیے۔ (۷) یہ وہ بات ہے جس کے پہلے نکتے سے سرسید نے کلی جبکہ دوسرے نکتے سے جزوی اختلاف کیا ہے۔ اولاً پہلے نکتے یعنی امورِ زندگی کی نگرانی ہر طرح پر سلطنت کے ہاتھ ہونے کے حوالے سے سرسید کی رائے ملاحظہ کریں:

> ''پچھلی بات میں مسٹر بکل سے مجھ کو کسی قدر اختلاف ہے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ لوگوں کو یہ خیال کہ بادشاہ وقت ہم کو یہ بتاوے کہ ہم کو کیا کیا کرنا چاہیے، انسان کی ترقی اور تہذیب کا نہایت قوی مانع ہے اور جس قدر کہ ہندوستان میں بلکہ تمام ایشیا میں اور ٹرکی اور ایجپٹ میں بھی ناشایستگی اور ناتہذیبی ہے اُس کا بڑا سبب یہی خیال ہے جو ہندوستان کی رعایا کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً گورنمنٹ سے ناراض رکھتا ہے۔ جب تک یہ خیال نہ جاوے گا اور یہ خیال نہ آوے گا کہ ہم خود سوچیں کہ ہم کو اپنے لیے کیا کرنا چاہیے، اُس وقت تک ہندوستان کے مسلمانوں کو نہ دولت ہوگی نہ حشمت، نہ عزت ہوگی نہ منزلت، اور نہ تہذیب ہوگی نہ شایستگی۔''(۸)

سرسید احمد خان کا یہ بیان اُن کے ایسے معترضین کے لیے کھلا جواب ہے جو انھیں سامراج کا ایجنٹ کہتے ہیں۔ اس بیان میں انھوں نے نہ صرف ٹامس بکل کے اُس نظریے سے اختلاف کیا ہے جو انگریزوں کی سامراجی حکومت کے مفادات کا محافظ ہے بلکہ اپنی قوم کو یہ یقین بھی دلایا ہے کہ اُس کی قسمت کی باگ ڈور حکومتِ انگلشیہ کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اُس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو عزت، قدر و منزلت اور تہذیب کا دامن تب ہاتھ میں آئے گا جب وہ خود سوچیں گے کہ انھیں اپنے لیے کیا کرنا ہے۔ سرسید کا ایک مضمون بعنوان 'اپنی مدد آپ' جو کئی نصابی کتب میں بھی شامل ہے اسی موضوع کو کھول کر بیان کرتا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:

> ''آدمی جس قدر دوسرے پر بھروسہ کرتے جاتے ہیں، خواہ اپنی بھلائی اور اپنی ترقی کا بھروسہ گورنمنٹ پر ہی کیوں نہ کریں یہ امر بدیہی اور لابدی ہے کہ وہ اسی قدر بے مدد اور بے عزت ہوتے جاتے ہیں۔ اے میرے ہموطن بھائیو! کیا تمہارا یہی حال نہیں ہے؟۔۔۔ قومی ترقی، قومی عزت، قومی اصلاح، عمدہ عادتوں، عمدہ چال چلن، عمدہ برتاؤ کرنے سے ہوتی ہے نہ گورنمنٹ میں بڑے بڑے حقوق اور اعلیٰ اعلیٰ درجے حاصل کرنے سے۔۔۔ کسی ملک کی خوبی و عمدگی اور قدر و منزلت بہ نسبت وہاں کی گورنمنٹ کے عمدہ ہونے کے زیادہ تر اس ملک کی رعایا کے چال چلن، اخلاق و عادات، تہذیب و شائستگی پر منحصر ہے کیونکہ قوم شخصی حالتوں کا مجموعہ ہے اور

ایک قوم کی تہذیب درحقیقت ان مرد وعورت وبچوں کی شخصی ترقی پر ہے جن سے وہ قوم بنی ہے۔"(۹)

مندرجہ بالا دونوں اقتباسات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرسید انسانی جذبات اورارادی افعال کے اعتدال کی ذمہ داری افراد پر ہی ڈالتے ہیں اور اس کا اختیار سلطنت کو دینے کے قائل نہیں۔ دوسرے معنوں میں وہ تہذیب اور شائستگی کا ضامن انسان کو سہی سمجھتے ہیں اور خود اپنی عزت کی عزت کرنے پر زور دیتے ہیں کہ یہی قدم جب تمام انسان مل کر اُٹھائیں گے تو معاشرے میں اعتدال اور توازن پیدا ہو گا اور وہ توازن ہی باہمی احترام کا ضامن ہے۔

اب ہنری بکل کے دوسرے نکتے کی طرف آتے ہیں جس کی رُو سے یہ ذمہ داری مذہب کو سونپی گئی ہے کہ وہ بتائے کہ عملی زندگی میں کس بات پر یقین رکھنا چاہیے۔ سرسید نے اس بات سے جزوی اختلاف بھی کیا ہے اور اتفاق بھی۔ وہ لکھتے ہیں:

"دوسرا جملہ جو مذہب سے متعلق ہے وہ کسی قدر صحیح ہے اور کسی قدر غلط۔ یعنی غلط مذہب بلاشبہ تہذیب کا بڑا مانع ہے اور اگر سچے مذہب میں غلط خیالات اور بے جا تعصبات اور مسائلِ اجتہادیہ اور قیاسیہ اس طرح پر مل جاویں کہ عملاً اور اعتقاداً اصلی احکامِ مذہبی میں اور اُن میں کچھ تفرقہ و تمیز نہ رہے، جیسا کہ مذہبِ اسلام کی موجودہ حالت ہے اور جو تقلید کی تاریکی میں آنکھوں سے بالکل چھپ گیا ہے تو بلاشبہ وہ بھی انسان کی ترقی اور تہذیب کا مثل مذہبِ غلط کے مانع قوی ہے۔ الاّ سچا مذہب جیسا کہ ٹھیٹ مذہب اسلام ہے وہ کبھی حارج ترقی انسان نہیں ہو سکتا کیونکہ اُس مذہب کے احکام اور تہذیب وشائستگی کے کام دونوں متحد ہوتے ہیں۔"(۱۰)

سرسید نے سامراجی مفادات کے محافظ ہنری بکل کے نظریے سے اختلاف کی نہایت بامعنی توجیہہ پیش کی۔ مندرجہ بالا بیان کے بین السطور سرسید کی یہ فکر کارفرما ہے کہ مذہب کو کلی اختیار دینے کا مطلب مذہب کا غلط استعمال کرنے والوں کو کھلی چھوٹ دینا بھی ہو گا۔ یوں مذہب کو ہی ہتھیار بنا کر یہ کہا جا سکے گا کہ چونکہ سب کچھ خدا کی مرضی سے ہی ہوتا ہے سو قوم کی ایسی زبوں حالی بھی اُسی کی مرضی ہے اور اس حالت سے نکالنے کے لیے اُسی نے سامراج کو ہم پر مسلط کیا ہے۔ گویا اس خاص نکتے پر ہنری بکل سے جزوی اختلاف کر کے سرسید نے بڑی احتیاط کے ساتھ اُس بیانیے کو رَد کیا ہے جو ہندوستان پر سامراجی حکومت کو جواز فراہم کر سکتا ہے۔ سرسید احمد خان کا یہ بیان کہ سچا مذہب جیسا کہ مذہبِ اسلام ہے کبھی انسانی ترقی میں حارج نہیں ہوتا کیونکہ اس کی کل تعلیمات انسانی زندگی کی ترقی اور بقا کا درس دیتی ہیں نہ کہ اُس کے جمود یا انہدام کا، مذہب کو انسانی آزادی اور ترقی کا ضامن ٹھہراتا ہے۔ وہ ہمیشہ خود پر بھروسہ کرنے اور اپنے ایقان کو مستحکم بنانے پر زور دیتے رہے۔ اُن کے تصورِ تہذیب کی رُو سے انسان بذاتِ خود تہذیب کی ضمانت ہے۔ وہ اپنے اعمال پر خود نظر کرے، اگر وہ اپنے اعمال کی درستی اور ترقی کے لیے سلطنت اور مذہب کی محتاجی لیتا ہے تو دراصل خود کو دوسری طاقتوں کے ہاتھ میں دے رہا ہو گا پھر وہ جیسے چاہیں اُسے چلائیں اور جس مقام پر چاہیں اُسے لے جائیں۔ اگر ایک سچے مذہب میں بے جا

تعصبات اور عصری تقاضوں سے متصادم مسائل اجتہادیہ و قیاسیہ ایسے گھس آئیں کہ قوم بھی تقلید کی پٹی آنکھوں پر باندھ کر صرف کانوں سے اُنھیں سنتی جائے اور عمل کرنے لگے تو یہ تہذیب کے انہدام کا سبب بنتا ہے۔ عصری تناظر میں دیکھیں تو یہی حالت آج ہماری قوم کی ہے۔ سرسید کی فکر آج بھی اتنی ہی موثر نظر آتی ہے۔ قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک ہم بحیثیت قوم کسی ایسی حکومت کے منتظر ہیں جو ہمیں ترقی کی راہ پر گامزن کر سکے، ایسے حکمرانوں کے جو ہمیں قومی عزت، قومی وقار اور قومی قدر و منزلت دلا سکیں۔ اس صورتحال کے لیے سرسید احمد خان نے لگ بھگ ڈیڑھ سو برس پہلے لکھا کہ جب تک یہ خیال نہیں آئے گا کہ ہم خود سوچیں کہ ہمیں اپنے لیے کیا کرنا چاہیے، اُس وقت تک ہماری قوم کو نہ دولت حاصل ہو گی نہ حشمت ،نہ عزت ہو گی نہ منزلت اور نہ تہذیب حاصل ہو گی نہ شائستگی۔ دوسرا نکتہ بھی اتنا ہی اہم ہے۔ ہم نے ایک مثالی حکومت کے بعد جس دوسری بڑی طاقت کو تہذیب کا منبع تسلیم کیا ہوا ہے وہ مذہب ہے۔ لیکن سچے مذہب اور اُس کے سچے اور اصل احکامات کو جاننے اور سمجھنے کی بجائے یا تو تقلید کی راہ اختیار کی ہوئی ہے یا پھر اُس مذہب کو ہی معاشرے میں تفرقہ پھیلانے اور انتہا پسندی کی ڈھال بنانے والوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ ہماری تہذیب کو اس وقت سب سے زیادہ خطرہ انھی لوگوں کی طرف سے ہے۔ موجودہ کارپوریٹ کلچر نے انسان اور انسانیت کو کموڈٹی بنانے میں مذہب کو بھی استعمال کیا ہے۔ اسلحہ بنانے اور بیچنے والے سرمایہ دار کو دنیا میں امن اور انسانیت نہیں چاہیے بلکہ کسی نہ کسی خطے میں جنگ جاری چاہیے جہاں اُس کی شے (اسلحہ) فروخت ہو سکے۔ وحشیانہ پن اور انسانیت کے درمیان جس تمیز کو سرسید نے تہذیب کی معراج قرار دیا تھا وہی تمیز معدوم ہوتی جا رہی ہے۔

سرسید احمد خان کے بعد علامہ اقبال کے افکار پر نظر ڈالیں تو اُن کے ہاں بھی تہذیب کی معنویت کی بنیاد احترامِ آدم اور آدمیت ہے گویا وہ طرزِ حیات جس سے وحشیانہ پن، حیوانیت، ظلم، بربریت، تشدد اور ناانصافی خارج ہو۔ اسلام کی آمد سے قبل خطۂ عرب کی قبائلی زندگی میں یہی وحشیانہ پن، بربریت اور ناانصافی موجود تھی۔ اسے اسلام نے آکر ختم کیا۔ نبی اکرم ﷺ نے جس تمدن کی بنیاد رکھی اُس میں آقا اور غلام کے درمیان حائل دیوار گرا کر اُس کی جگہ احترامِ آدمیت کا احساس رکھ دیا۔ گویا انسانوں کو انسان سمجھنا، عورت ہو یا مرد اُسے انسانیت کے مرتبے پر فائز کرنا، اُن کے بنیادی انسانی حقوق کو مساوات پر استوار کرنے کا عمل نئی تہذیب کی بنیاد بنا۔ علامہ اقبال اُسی تہذیب کے معترف ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ خلافت و ملوکیت کے سب سے بڑے ناقد بھی ہیں۔ اُن کے خیال میں اسلامی تہذیب کو سب سے بڑا خطرہ ملوکیت سے ہے کیونکہ اس میں بادشاہ اور رعایا کے درمیان اُس انسانی احساس اور احترام کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے جو دینِ اسلام کی بنیاد ہے۔ جبھی وہ جاوید نامہ میں حکمتِ قرآن اور تخلیقِ آدم کی معنویت کو نمایاں کرتے ہوئے کہتے ہیں:

برتر از گردون مقامِ آدم است — اصلِ تہذیب احترامِ آدم است (۱۱)

جاوید نامہ کا ہی ایک اور شعر دیکھئے کہ جس میں زندگی گزارنے کے لیے عشق کو شریعت اور آئین کا درجہ دیتے ہیں۔ یہ گہرا عشق یقین خدا اور اُس کے بندوں سے مراد ہے۔ اقبال کے نزدیک یہی دین ہے اور تہذیب دین سے الگ کوئی چیز نہیں:

زندگی را شرع و آئین است عشق　　　اصلِ تہذیب است دین، دین است عشق (۱۲)

سرسید احمد خان کا بھی یہی نقطۂ نظر تھا کہ سچے مذہب کے احکامات اور تہذیب و شائستگی کبھی بھی ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہو سکتیں۔ یہ متحد اور یکساں ہوتے ہیں۔ دینِ اسلام کے احکامات میں بھی انسانی تہذیب کی ترقی بنیادی نکتہ ہے لیکن جب ان دونوں کو الگ کر کے یا اصل دینی تعلیمات میں فرقہ وارانہ تعصب کو شامل کر کے قومی معاملات چلانے کی کوشش کی جائے تو یہ قوم کی نامرادی پر منتج ہو گی۔ 'بالِ جبریل' کی نظم 'دین و سیاست' میں اقبالؔ فرماتے ہیں:

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی　　　ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری

دوئی ملک و دیں کے لیے نامرادی　　　دوئی چشمِ تہذیب کی نابصیری (۱۳)

اقبالؔ نے اپنی معاصر مغربی تہذیب پر بہت شدید اعتراضات کیے۔ کلام اقبالؔ میں اِسے 'تہذیبِ نو'، 'تہذیبِ جدید'، 'تمدنِ جدید'، 'تہذیبِ حاضر' یا پھر صرف 'تہذیب' کہہ کر اس کے انسانیت کُش عناصر پر تنقید کی گئی ہے۔ اقبالؔ اُس تہذیب کی آزادی کو باطن کی گرفتاری قرار دیتے تھے کہ ظاہری صورت میں تو یہ تہذیب روشن چہرہ رکھتی ہے اور مادی ترقی کی بات کرتی ہے لیکن اس کا باطن چنگیزی فطرت رکھتا ہے۔ یہ تہذیب سرمایہ دارانہ نظام کی تہذیب ہے جس میں انسان اور انسانیت کی کوئی قدر نہیں۔ کہتے ہیں:

مجھے تہذیبِ حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی　　　کہ ظاہر میں تو آزادی ہے، باطن میں گرفتاری (۱۴)

اسی موضوع پر 'طلوعِ اسلام' سے چند اشعار ملاحظہ کریں:

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے　　　قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی　　　یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا　　　جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے (۱۵)

سرمایہ دارانہ نظام کے ساتھ کوئی بھی قوم صحیح معنوں میں آزاد نہیں ہو سکتی۔ اقبالؔ کا خیال ہے کہ آزاد معیشت ہی دراصل کسی بھی قوم کی سیاسی آزادی کی بنیاد بن سکتی ہے۔ سرمایہ داری کو اقبالؔ نے دنیوی زندگی کی سب سے بڑی لعنت کے طور پر دیکھا۔ یہ سرمایہ داریت کا پوری دنیا میں فروغ ہی تھا جس کی وجہ سے آج کم و بیش ہر ملک ہی کارپوریٹ کلچر کا شاخسانہ

نظر آتا ہے اور ہر انسان کی اور اُس کے ہر عمل کی ایک قیمت مقرر ہے۔ اقبالؔ نے اِسے آدم دری کی تہذیب کا نام دیتے ہوئے برسوں پہلے کہا تھا کہ:

شیوۂ تہذیبِ نو آدم دری است　　　پردۂ آدم دری سوداگری است (۱۶)

مذکورہ مادی تہذیب پر 'بانگِ درا' کی ایک نظم میں یوں طنز کرتے ہیں:

تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض　　　دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجیے

بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پسِ از سبق　　　کہتا ہے ماسٹر سے "بل پیش کیجیے"! (۱۷)

سر سید احمد خان کا جب ۱۸۹۸ء میں انتقال ہوا تب اقبال ابھی نوجوانی میں قدم رکھ رہے تھے لیکن اپنی قوم کی حالت پر پریشاں حال تھے۔ ہندوستان کی تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھیں تو ۱۸۵۷ء کے بعد شکست خوردہ مسلمانوں کو تہذیبی سطح پر بطور قوم الگ شناخت دلانے اور باوقار طریقے سے زندگی کرنا سکھانے میں سر سید احمد خان اور علامہ اقبالؔ کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔ فلسفیانہ سطح پر دیکھیں تو ان دونوں دانش وروں نے برصغیر میں مغرب کے اس دعوے کو اپنے علمی کام کی بنا پر رَد کیا کہ اسلام سائنس دشمن یا جامد مذہب ہے یا عصرِ حاضر میں اس کی معنویت قائم نہیں رہی۔ سر سید نے تو نیچر کے اصولوں کی روشنی میں مذہب پر جتنا لکھا اُس ضمن میں اُن کی مخالفت بھی بہت زیادہ ہوئی لیکن اقبالؔ خوش قسمت رہے کہ اُن کی مخالفت اُس طرح سے نہ ہوئی۔ خواجہ حسن نظامی کو تصوف پر اقبالؔ کا وار پسند نہ آیا تو دونوں میں معرکہ آرائی شروع ہوئی وگرنہ دیکھا جائے تو اقبالؔ کے مذہبی نظریات سر سید سے مختلف تھے نہ ہی اپنی قوم کی تہذیبی صورتحال کے حوالے سے اُن کی رائے سر سید کے برعکس تھی۔ مثلاً اکتوبر ۱۹۰۴ء میں جب ابھی اقبالؔ چھبیس سال کے نوجوان تھے اُن کا ایک مضمون 'قومی زندگی' کے عنوان سے مخزن میں چھپا۔ نوجوان اقبالؔ اپنی قوم کی حالت کے حوالے سے اس مضمون میں لکھتے ہیں:

> "مسلمانوں کو دیکھا جائے تو ان کی حالت نہایت مخدوش نظر آتی ہے۔ یہ بدقسمت قوم حکومت کھو بیٹھی ہے، صنعت کھو بیٹھی ہے، تجارت کھو بیٹھی ہے۔ اب وقت کے تقاضوں سے غافل اور افلاس کی تیز تلوار سے مجروح ہو کر ایک بے معنی توکّل کا عصا ٹیکے کھڑی ہے۔ اور باتیں تو خیر ، ابھی تک ان کے مذہبی نزاعوں کا ہی فیصلہ نہیں ہوا۔ آئے دن ایک نیا فرقہ پیدا ہوتا ہے جو اپنے آپ کو جنت کا وارث سمجھ کر باقی تمام انواعِ انسانی کو جہنم کا ایندھن قرار دیتا ہے۔ غرض کہ ان فرقہ آرائیوں نے خیر الامم کی جمعیت کو کچھ ایسی بری طرح منتشر کر دیا ہے کہ اتحاد و یگانگت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔" (۱۸)

اِسی مضمون میں مزید لکھتے ہیں:

"دنیا میں کسی قوم کی اصلاح نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس قوم کے افراد اپنی اصلاح کی طرف توجہ نہ کریں۔ کیونکہ جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے فرد کے تمام افعال و حرکات حقیقت میں قومی افعال و حرکات ہیں، یہاں تک کہ اس کی زندگی بھی اپنی نہیں بلکہ قوم کی ملکیت ہے۔"(۱۹)

ارمغانِ حجاز کی نظم 'بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو' کا یہ معروف شعر بھی اسی موضوع پر ہے کہ:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد کے ملت کے مقدر کا ستارہ (۲۰)

اقبالؔ اپنے قوم کی مجموعی حالت میں بہتری کے لیے انفرادی سطح کی کوشش کو ہی کامیابی سمجھتے ہیں بالکل اُسی طرح جیسے سرسید احمد خان نے اپنے مضمون 'اپنی مدد آپ' میں قوم کی مجموعی حالت کو شخصی حالتوں کا ہی مجموعہ قرار دیا ہے۔ اقبالؔ نے ایک طرف مسلمانوں کی معاشرتی حالت کی درستی کو تہذیبِ مغرب سے کنارہ کشی پر استوار کیا تو دوسری طرف مذہبی معاملات میں اجتہاد پر زور دے کر عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگی تلاش کی۔ اقبالؔ نے اپنے خطبات میں اصولِ حرکت پر یقین لانے پر بھی زور دیا اور بتایا کہ نئے تقاضوں کے مطابق فقہ و قانون کے اصولوں کی از سرِ نو تعبیر کا حق [قرآنِ پاک کے احکامات کی روشنی میں بھی] مسلمانوں کو حاصل ہے۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

"۔۔۔ مسلمانوں کا آزاد خیال طبقہ اگر اس امر کا دعویدار ہے کہ اسے اپنے تجربات، علیٰ ہذا زندگی کے بدلتے ہوئے احوال و ظروف کے پیشِ نظر فقہ و قانون کے بنیادی اصولوں کی از سرِ نو تعبیر کا حق پہنچتا ہے تو میرے نزدیک اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو غلط ہو۔ قرآنِ پاک کا یہ ارشاد کہ زندگی ایک مسلسل تخلیقی عمل ہے بجائے خود اس امر کا مقتضی ہے کہ مسلمانوں کی ہر نسل اسلاف کی راہنمائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مسائل آپ حل کرے۔۔"(۲۱)

ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے مطابق سرسید احمد خان کی تفسیر اور 'خطباتِ احمدیہ' اور اقبال کے لیکچرز 'تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ' (Reconstruction of Religious Thoughts In Islam) اسلامی ہند کی فکری ترقی کے روشن مینار ہیں (۲۲)۔ ان دونوں مفکرین کی فکر نے برصغیر کے مسلمانوں کو ۱۸۵۷ء کے بعد مذہبی اور معاشرتی حوالے سے درپیش چیلنجز کا سامنا کرنے کی توانائی مہیا کی اور تہذیب کے اُن جدید معنوں سے رُوشناس کرایا جسے آج کا دانشور روایتی تصورِ تہذیب قرار دیتا ہے۔ وہی روایتی تصورِ تہذیب تھا جس نے مسلمانوں کی قومی شناخت کو نمایاں کیا لیکن مقامِ حیرت ہے کہ ان دونوں مفکرین کے گزرنے کے برسوں بعد بھی تہذیبی سطح پر ہم وہیں کھڑے ہیں جہاں اُن کے دور میں تھے۔ آج بھی جو جذبہ ناپید ہے وہ احترامِ آدم کا ہے۔ ریاست تو موجود ہے بلکہ آج ہم ایک آزاد ریاست کے شہری ہیں لیکن آزادی سے اپنا حق بھی نہیں مانگ سکتے۔ ہمارے آئین کے آرٹیکل ۸ سے ۲۸ تک شہریوں کے بنیادی حقوق کی فہرست تو موجود ہے لیکن ریاست ان حقوق کا مہیا کرنا اپنی ذمہ داری نہیں سمجھتی۔ ریاست سے شکوہ کرتے ہوئے سرسید یاد آتے ہیں جنھوں نے بار بار کہا تھا کہ اپنی شخصی حالتوں کو بہتر بنانا ہماری پہلی ترجیح ہونا چاہیے اور یہ کام ریاست کے نہیں اپنے خود کے کرنے کا ہے۔ اقبالؔ نے بھی قوم کی

تقدیر کی ذمہ داری افراد پر ہی ڈالی ہے۔ چنانچہ یہ سوال بہت اہم ہے کہ ہم انسانوں کے گروہ میں رہتے ہوئے خود ایک دوسرے کو اُس کا کتنا حق دیتے ہیں۔ کیا ہم اپنی عورتوں کو جائیداد میں اُن کا پورا حصہ دیتے ہیں؟ کیا ہم اپنے سب بچوں کو تعلیم کے یکساں مواقع فراہم کرتے ہیں؟ کیا ہم دفتروں میں اپنے ماتحتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں؟ کیا ہم جن پیشوں سے منسلک ہیں وہاں اپنے فرائض پوری طرح انجام دے رہے ہیں؟ اقبالؔ نے جس قوم کے افراد کے لیے برسوں پہلے کہا تھا کہ:

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود　　　　یہ مسلماں ہیں! جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود (۲۰)

اُس قوم کی موجودہ حالت اخلاقی زوال کی مجسم صورت ہے۔ بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہو، تشدد ہو، بدعنوانی اور اقرباپروری ہو، غیرت کے نام پر قتل اور تیزاب گردی کے واقعات ہوں، مسلکی اور نسلی فرقہ واریت ہو غرض متمدن دنیا کی نظروں میں ہر نوع کی ناپسندیدہ وارداتوں میں ہمارے ملک کا گراف بہت اونچا ہے۔ ان سب کے ساتھ مذہبی انتہاپسندی اور دہشت گردی کے چیلنجز نے بھی ہمارے قومی وقار کو اقوام عالم کی نظروں میں بہت مجروح کیا ہے۔ عصری تناظر میں سرسید احمد خان اور علامہ اقبال کے تصوراتِ تہذیب کے مطالعات مثبت بیانیے کا منبع بننے کی پوری توانائی رکھتے ہیں ۔ ان تصورات کی روشنی میں وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز، سلطنت اور مذہب کو انفرادی زندگی کی کوچوانی کا کل اختیار نہ دینا اور احترام آدمیت ہی وہ بنیادی نکات ہیں جو موجودہ کارپوریٹ کلچر میں ہر انسان اور اُس کے عمل کو کموڈٹی کی طرح تولنے والوں کی طرف مزاحمت کی اساس بن کر ہمارے تہذیبی عروج کا سرچشمہ بن سکتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ہسٹری آف سویلائزیشن اِن انگلینڈ[History of Civilization in England]کی پہلی جلد ۱۸۵۸ء میں جبکہ دوسری جلد ۱۸۶۱ء میں شائع ہوئی۔ پہلی جلد میں تاریخِ تمدن کا توضیحی خاکہ پیش کیا گیا ہے اور زیادہ تر تہذیب کی نظری بحث پر مشتمل ہے جبکہ دوسری جلد یورپ کے تہذیبی ارتقا پر ہے۔ سرسید احمد خان نے تہذیب الاخلاق میں ہسٹری آف سویلائزیشن کے ایک باب کا ترجمہ اپنی تمہید کے ساتھ شائع کیا تھا۔ ان دو جلدوں کا اُردو میں ترجمہ مع تمہیدی مضمون و حواشی منشی محمد احد علی کاکوری، بی اے ایل ایل بی نے انجمن ترقی اُردو (ہند)، اورنگ آباد کی فرمائش پر اُس وقت کیا جب وہ بادہ بنکی میں وکالت کر رہے تھے۔ اتفاق سے منشی محمد احد علی بھی ہنری تھامس بکل کی طرح ترجمہ کا منصوبہ مکمل ہونے سے پہلے ہی انتقال کر گئے۔ وہ چھ ابواب کا ترجمہ ہی کر پائے۔ ساتویں باب کا ترجمہ مولوی عبدالماجد نے کیا اور یوں سات ابواب پر مشتمل یہ کتاب دو جلدوں میں انجمن ترقی اُردو (ہند) نے شائع کی اور علامہ شبلی نعمانی نے اس کا دیباچہ لکھا۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ سرسید نے بکل کے لفظ 'سویلائزیشن' کا ترجمہ تہذیب جبکہ منشی محمد احد علی نے تمدن کیا ہے لیکن اپنے تمہیدی مضمون میں وضاحت کر دی ہے کہ وہ بھی [سرسید احمد خان کی طرح] اس لفظ سے مراد 'ترقی' نہیں بلکہ وحشیانہ پن اور اُجڈپن کا متضاد [شائستگی] لیتے ہیں۔ {ہنری ٹامس بکل، تاریخ تمدن، جلد اول، ترجمہ: محمد احد علی، انجمن ترقی اُردو (ہند)، اورنگ آباد، ۱۹۳۳ء، ص ۱۱}۔

۲۔ سبطِ حسن، سید، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا (کراچی، مکتبہ دانیال، ۲۰۰۲ء)، ص ۲۰

۳۔ بقول شیخ محمد اسماعیل پانی پتی (مقالاتِ سرسید کے مرتب): تہذیب الاخلاق جلد ۵ نمبر ۱۳ بابت یکم شوال ۱۲۹۱ھ کے پرچے میں سرسید نے ہنری طامس بکل کی مشہور عالم کتاب "ہسٹری آف سویلائزیشن" کے ایک اہم حصے کا اُردو ترجمہ شائع کیا اور اس پر اپنے قلم سے ایک بہت مفید تمہید لکھی۔[مقالاتِ سرسید، جلد ششم، ۱۹۶۲ء، ص ا] یہ مضمون دراصل وہ تمہید ہی ہے جس میں ہنری طامس بکل کی کچھ باتوں سے اتفاق اور کچھ سے اختلاف کرتے ہوئے سرسید نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

۴۔ سرسید احمد خان، تہذیب اور اُس کی تاریخ اور افعالِ انسانی کے باقاعدہ ہونے کا ثبوت، مشمولہ: مقالاتِ سرسید، جلد ششم، مرتبہ: مولانا اسماعیل پانی پتی (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء)، ص ۲۔۳

۵۔ ایضاً، ص ۴

۶۔ ایضاً، ص ۵۔۶

۷،۸۔ ایضاً، ص ۷

۹۔ سرسید احمد خان، اپنی مدد آپ، مشمولہ: مضامینِ سرسید، مرتبہ: عزیز الدین اختر (علی گڑھ: مسلم ایجوکیشنل پریس، س۔ن)، ص ۱۱۳۔۱۱۵

۱۰۔ سرسید احمد خان، مقالاتِ سرسید، جلد ششم، ص ۸

۱۱۔ اقبالؔ، محکماتِ عالمِ قرآنی: جاوید نامہ، کلیاتِ اقبال (فارسی)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۵۴۱

۱۲۔ اقبالؔ، تذکیر نبیۂ مریخ: جاوید نامہ، کلیاتِ اقبال (فارسی)، ص ۵۸۵

۱۳۔ اقبالؔ، دین و سیاست: بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال (اُردو)، نیشنل بک فاونڈیشن، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۴۴۶

۱۴۔ اقبالؔ، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال (اُردو)، ص ۳۷۲

۱۵۔ اقبالؔ، طلوعِ اسلام: بانگِ درا، کلیاتِ اقبال (اُردو)، ص ۳۰۵

۱۶۔ اقبالؔ، در اسرارِ شریعت: پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق مع مسافر، کلیاتِ اقبال (فارسی)، ص ۱۰۷

۱۷۔ اقبالؔ، تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ!: بانگِ درا، کلیاتِ اقبال (اُردو)، ص ۳۱۶۔۳۱۷

۱۸۔ اقبالؔ، قومی زندگی: مضامینِ اقبال، مرتبہ: تصدق حسین تاج، اعظم اسٹیم پریس مغلپورہ، حیدر آباد دکن، ۱۳۶۲ھ، ص ۳۷

۱۹۔ ایضاً، ص ۳۹

۲۰۔ اقبالؔ، بڑھے بلوچ کی نصیحت: ارمغانِ حجاز، کلیاتِ اقبال (اُردو)، ص ۱۳۷

۲۱۔ علامہ اقبال، الاجتہاد فی الاسلام (ا): تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ترجمہ: سید نذیر نیازی، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۵۸ء، ص ۲۶۰

۲۲۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، سرسید احمد خان اور جدت پسندی، پیس پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۱ء، ص ۱۱۲

۲۳۔ اقبالؔ، جوابِ شکوہ: بانگِ درا، کلیاتِ اقبال (اُردو)، ص ۲۳۱